گوپی چند نارنگ

"......... میرے نزدیک تحقیق میں سب سے زیادہ اہمیت تحقیق کی ضرورت کے واضح احساس کی ہے۔ تحقیق برائے تحقیق گھانس کھودنے کا شغل ہے۔ ادبی تحقیق وہی کارآمد ہے جو کسی نفسیاتی، تاریخی یا سماجی مسئلے کو حل کرنے کی طرف قدم اٹھائے یا کسی ایسی صداقت کے چہرے سے نقاب اٹھائے جس سے دوسری اہم صداقتوں کا پتہ چلانے میں مدد ملے ...."

ترقی یافتہ ملکوں میں آئی بی ایم (I. B. M) مشینوں کی وبا نہایت تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ اعداد و شمار کی دنیا میں ان کی ضرورت سمجھ میں آسکتی ہے، لیکن لُطف کی بات یہ ہے کہ انسان کی شخصیت کا تجزیہ بھی اب سوراخ دار کارڈوں کا محتاج ہو کے رہ گیا ہے۔ حال میں ایک جعلی مصنف مارک اسے پرنی (MARK EPEANAY) کی کتاب "دی مک لینڈرس ڈائی من شن" (THE MCLANDRESS DIMENSION) شائع ہوئی ہے۔ اس کا مرکزی کردار ہارورڈ یونیورسٹی کا ایک ذہین پروفیسر مک لینڈرس ہے۔ جس کی شہرت کا دار و مدار اس بات پر ہے کہ اس نے "مک لینڈرس کوائی شنٹ" (MCLANDRESS COEFFICIENT) کا نیا نظریہ دریافت کیا ہے۔ مختصراً اس نظریے کو "مک ایل سی (MC. ELSEE) بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ شخصیت کے تجزیے کا مشینی نظریہ ہے۔ اس رُو سے یہ جاننے کی کوشش کی جاتی ہے کہ دیئے گئے وقت میں ایک شخص اپنی تقریر یا تحریر تک اپنے خیالات کو اپنے علاوہ دوسرے موضوعات پر مرکوز رکھ سکتا ہے یا عام غور و فکر میں وہ کتنی بار صیغۂ متکلم کا استعمال کرتا ہے اور کتنی بار اپنی ذات و شخصیت کی طرف پلٹ آتا ہے۔ ان اعداد و شمار کی مدد سے یہ پتہ چلانا دشوار نہیں کہ کون شخص اپنی انا کا زیادہ شکار ہے اور کون کس حد تک غیر جانب داری سے دوسرے مسائل پر یک سو ہو کر سوچ سکتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کتاب کے اصلی مصنف ہندوستان میں امریکہ کے سابق سفیر گال بریتھ ہیں جو خود ہارورڈ یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں اور جن کا شمار چوٹی کے ماہرین اقتصادیات و معاشیات میں ہوتا ہے۔ بہرحال اس نظریے کی رُو سے بعض نہایت دلچسپ نتائج برآمد ہوئے ہیں، مثلاً صدر کینیڈی مرحوم اپنی ذات کو محض ڈھائی منٹ تک بھول سکتے تھے۔ ان سے کہیں بہتر ریکارڈ فلمی اداکارہ الزبتھ ٹیلر کا ہے یعنی تین منٹ، اور بیچارے راک فیلر تو ۹ سیکنڈ سے زیادہ نہیں ٹِک سکتے۔ اس نظریے کی مدد سے اگر اردو شاعروں اور ادیبوں کا "مک ایل سی" دریافت کرنے کی کوشش کی جائے تو جہاں ایک طرف تفریح کا خاصا سامان فراہم ہو جائے گا وہاں کئی ماتھوں پر بل پڑ جائیں گے اور بھوئیں بھی تن جائیں گی۔ ظاہر ہے آپ بیتی نمبر کے صفحات اس سلسلے میں بہترین مواد کا کام دے سکتے ہیں! لیکن اس میں ایک خطرہ بھی ہے، وہ یہ کہ ادیب اور شاعر کچھ عجیب مخلوق واقع ہوئے ہیں۔ جب انھیں "میں" کے موضوع پر بولنے کو کہا جائے تو "میں" سے زیادہ انھیں "تو" کا خیال رہتا ہے۔ بہرحال اگر کسی کو ہوس کسی کو "برہنہ" دیکھنے کی ہے تو وہ زیادہ آس نہ لگائے، کیونکہ اس حمام سے جو بھی نکلے گا، "صیغۂ متکلم" میں ملبوس نکلے گا۔

ایک زمانہ تھا کہ کسر نفسی اور کم نمائی کو مشرقی آداب میں بڑی اہمیت حاصل تھی۔ جمہوری دور میں اسے قابل اعتنا سمجھا جائے یا نہیں مگر "مک ایل سی" کے نظریے نے (تفریحاً ہی سہی) اسی بنیادی خوبی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ فارسی دان نے بھی کیا خوب کہا ہے ؎

آنکس کہ بداند و بداند کہ نداند　　اسپِ طرب خویش بہ افلاک رساند

وانکس کہ بداند و بداند کہ بداند　　او ہم خرکِ لنگ بہ منزل برساند

وانکس کہ نداند و بداند کہ بداند　　در جہل مرکب ابدالدہر بماند

یعنی جو شخص جانتا ہے اور جانتا ہے کہ میں نہیں جانتا، وہ تو اپنا طرب کا گھوڑا آسمانوں تک لے جاتا ہے۔ اور جو شخص جانتا ہے اور جانتا ہے کہ میں جانتا ہوں، وہ بھی اپنے لنگڑے گدھے کے ساتھ منزل تک جا پہنچتا ہے۔ اور جو شخص نہیں جانتا اور جانتا ہے کہ میں جانتا ہوں، وہ ہمیشہ جہل مرکب کا شکار رہتا ہے، گویا اصل عالم وہ ہیں جنھوں نے اپنا اشتہار لگانا پسند نہیں کیا (باوجود تقاضوں کے) دوسرے درجے پر وہ معقول لوگ ہیں جو عالم ہیں اور جنھوں نے ان صفحات میں خود کو عالم تصور کیا ہے۔ تیسرے درجے پر مجھ جیسے جاہل ہیں جو کچھ نہ جانتے پر بھی اپنے جاننے اور نہ جاننے والوں کے لیئے ذہنی اذیت کا باعث بنتے ہیں!!

قلم اُٹھاتے وقت سب سے پہلے یہی خیال آیا کہ آپ بیتی کو خاندان کے ذکر سے شروع کیا جائے یا وطن کی "خاکِ پاک" کو مقدم سمجھا جائے۔ پھر یہ بھی خیال آیا کہ بعض روایتوں کی رُو سے "تاریخ پیدائش" سے بسم اللہ کرنا زیادہ مناسب ہے۔ سماجی مسلّمات بھی خوب ہیں، اکثر و بیشتر سُنی سُنائی پر یقین کر لیا جاتا ہے اور پھر غضب یہ کہ دوسروں سے بھی یقین کرنے کو کہا جاتا ہے، اور چاروناچار ہر شخص کر بھی لیتا ہے بہرحال مجھے معلوم نہیں کہ میں کب پیدا ہوا۔ اتنا یاد ہے کہ چوتھے درجے میں جب نئے اسکول میں داخل ہوا تو نیا فارم بھرنے کی ضرورت پیش آئی۔ والد صاحب نے تاریخ پیدائش یکم جنوری ۱۹۲۱ء لکھوا دی۔ نوروز کا نوروز، سالگرہ کی سالگرہ۔ اس دن سے یہی تاریخ پیدائش چلی آتی ہے۔

والد صاحب بلوچستان سروس میں افسر خزانہ تھے، سنتا آیا ہوں کہ میری پیدائش تحصیل دکی میں ہوئی۔ اس کے سال ڈیڑھ سال بعد والدین وہاں سے موسیٰ خیل آ گئے۔ مجھے یاد نہیں دکی کیسا گاؤں یا شہر تھا، البتہ موسیٰ خیل کے کچھ دھندلے سے نقش ذہن کی سلوٹوں میں ابھی باقی ہیں۔ تحصیل کے مکانوں کے پیچھے کا بڑا سا باغ جس میں انار، ناشپاتی اور شفتالو کے درخت اور انگور کی بیلیں تھیں چاروں طرف چھوٹے بڑے پہاڑ، مختصر سا بازار جس میں ڈاک کی لاری رکا کرتی تھی۔ سب بچے اسی میں چڑھ جاتے اور ڈاک گھر سے بازار تک کی سیر کرتے۔ مغرب میں پتھریلی سڑک تھی جو فورٹ سنڈیمن کو جاتی تھی۔ اسی کے راستے میں ندی پر وہ پل تھا جس کے نیچے گہرے نیلے پانی میں ہم کنکر پھینکتے تو مچھلیوں کے سنہرے پر چمکنے لگتے۔

شمال میں چھوٹا سا اسکول تھا جس میں پڑھائی کم اور انسپکٹر کے استقبال کی تیاری زیادہ کی جاتی تھی۔ اُردو کا پہلا قاعدہ یہیں پڑھا۔ پڑھانے عبدالعزیز صاحب تھے، ماسٹر، ہیڈ ماسٹر، کلرک سبھی کچھ وہی تھے۔ میں اس زمانے میں اُستاد سے کچھ کچھ ڈرا کرتا تھا۔ اس سے بھی کئی گنا زیادہ ڈر امتحان کا تھا۔ جس کے بارے میں معلوم ہی نہیں تھا کہ ہے کیا بلا؟ کچھ کچھ یاد ہے کہ جب پہلی جماعت کا امتحان ہوا تو میں گھر میں دبکا رہا۔ بعد میں والد صاحب اور بڑے بھائی صاحب پکڑے پکڑے لائے اور کہا بیچارے کا سال برباد ہونے سے بچالیجیے۔ عبدالعزیز صاحب نے قاعدے کا دوسرا صفحہ کھولا اور قدرے سختی سے کہا۔ یہاں سے سُناؤ۔ دہشت تو طاری تھی ہی، میں نے بدحواسی میں قاعدہ بند کیا اور بجائے پڑھ کے سُنانے کے جیسے جماعت میں رٹا کرتا تھا۔ زبانی ہی سُنانا شروع کیا۔ ابھی پورا سبق نہ سُنا پایا تھا کہ انھوں نے کہا۔ بس بس تم پاس۔ نہ صرف پاس بلکہ اوّل! والد صاحب نے گلے لگا لیا۔ آنسو پونچھے اور کندھے پر بٹھا کر گھر لے آئے۔ وہ دن اور آج کا دن، کتاب میری بہترین رفیق اور دمساز بن گئی۔

میں تیسری جماعت میں تھا کہ دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی۔ حکومت ہند بلوچستان کے قبائلی علاقوں میں [illegible] لٹریچر

تقسیم کرتی تھی۔ یہ سارا پشتو اور اُردو میں ہوا کرتا تھا۔ اُردو پڑھنے کا چسکا یہیں سے پڑا۔ دہلی سے جو رسالہ آجکل کے نام سے شائع ہوتا ہے اس کا ابتدائی نام نن پرون تھا اور یہ پشتو رسالے کے ضمیمے کے طور پر شائع کیا جاتا تھا۔ اسے سب سے پہلے میں نے اسی زمانے میں دیکھا، پھول اور غنچہ سے میری شناسائی بعد میں ہوئی۔

پرائمری کے بعد میں لیہ ضلع مظفر گڑھ چلا آیا، کیونکہ جن علاقوں میں والد صاحب کی ملازمت تھی وہاں بعض جگہ ہائی اسکول نہیں تھے۔ گو بیچ بیچ میں میں دو تین سال کے لیئے کوئٹہ پشین کے اسکولوں میں بھی پڑھتا رہا لیکن زیادہ وقت لیہ ہی میں بسر ہوا۔ اُردو لازمی مضمون تھا، سنسکرت اختیاری۔ پنڈت جی خالی پرچے پر بھی سو میں سے نوے نمبر دیا کرتے تھے۔ اُردو کے اُستاد مولوی مرید حسین تھے۔ میں نے انہیں کبھی غصّے میں آپے سے باہر ہوتے ہوئے نہیں دیکھا۔ کسی کو بے جا پیٹتے بھی نہیں تھے۔ نہایت نرمی اور ہمدردی سے گفتگو کرتے اور پدرانہ شفقت سے پڑھاتے تھے۔ خدا جانے اب زندہ بھی ہیں کہ نہیں۔ سفید پگڑی باندھتے تھے، لمبا قد، چھریرا بدن کھچڑی داڑھی، سردیوں میں خاکی رنگ کا موٹا اونی کوٹ پہنتے تھے۔ بات بڑے دل نشین انداز میں کرتے تھے۔ اقبال اور چکبست کی نظمیں انھوں نے جس انداز میں پڑھائی تھیں، اب تک یاد ہے۔ نذیر احمد، رتن ناتھ سرشار اور راشد الخیری کی کتابیں انھیں بے حد پسند تھیں اور ہمیں بھی پڑھنے کو کہا کرتے تھے۔ اُردو سے محبت کی پہلی چنگاری انھیں نے روشن کی۔ ادبی دنیا، ہمایوں اور ادبِ لطیف کے تازہ شمارے جماعت میں پڑھنے کو لا دیا کرتے تھے۔ میرے اس زمانے کے ساتھیوں میں ایک صاحب ریاض انور تھے، جن کا کلام بعد میں پاکستان کے اُردو رسائل میں شائع بھی ہوتا رہا۔ سنا ہے اب وکالت کو پیارے ہو گئے ہیں اور شعر کم کہتے ہیں جرح زیادہ کرتے ہیں۔ مڈل کے بعد بھی میں مرید حسین صاحب سے اُردو پڑھنا چاہتا تھا، لیکن ہیڈ ماسٹر کے حکم سے سائنس کی جماعت میں بیٹھنا پڑا۔ دوسرے اُستاد جن کی شخصیت سے میں بے حد متاثر ہوا، سعادت مند صاحب تھے۔ وہ ڈرل سے ڈرائنگ کے ماسٹر تھے۔ واٹر کلر اور چہرے کی تصویر اُتارنے میں انھیں کمال حاصل تھا۔ چند لڑکے آدھی چھٹی کے وقت ان کے پاس جمع ہو جاتے اور وہ واٹر کلر سے تصویر کھینچنے کی مشق کراتے۔ افسوس اس ذوق کی تکمیل نہ ہو سکی۔ لیکن اب بھی پُرانا شوق جاگ اٹھتا ہے تو کاغذ اور رنگ کے ضائع ہونے میں کوئی کسر باقی نہیں رہتی۔

گورنمنٹ ہائی اسکول کے ہال کمرے میں سامنے کی دیوار پر آنرز بورڈ تھا۔ اس پر ہر سال میٹرکولیشن امتحان میں اوّل آنے والے طالب علم کا نام اور نمبر لکھے جاتے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ یہ بورڈ دیوار پر نہیں، آسمان میں لگا ہوا ہے۔ اور ہر وہ طالب علم جس کا نام اس پر درج ہے، بہت بڑا فرشتہ ہے۔ بہرحال اوّل آنے کی میری ہوس ۱۹۴۶ء میں پوری ہوئی نام لکھا گیا کہ نہیں، مجھے معلوم نہیں، کیونکہ نتیجے کے اعلان سے بہت پہلے میں وہاں سے جا چکا تھا اور فلکِ بے انصاف یا با انصاف نے پھر اس اسکول کی زیارت کا موقع ہی نہیں دیا۔ پہلے پہل میں سنڈے مَن کالج کوئٹہ میں داخلہ کے لیئے پہنچا۔ یہاں اچھے نمبروں کی بنا پر فیس تو معاف ہو گئی، وظیفہ نہ ملا، میں نے لائل پور زراعتی کالج کا رُخ کیا، یہاں میرے پہنچنے سے پہلے ہی داخلہ نمٹ چکا تھا۔ وہاں سے دہلی چلا آیا۔ اتنے میں آزادی کا آفتاب نکلا اور میں اور میرے گھر والے ایک دوسرے کے لیئے اندھیرے میں آ گئے۔ اس دوران میں میں مجبوراً "جیب کی مشقت" میں لگ گیا اور جب جب وقت ملتا کچھ پڑھ بھی لیتا۔ اس طرح ایف۔ اے اور بی۔ اے کی منزلیں تمام ہوئیں۔ تین چار سال کے بعد گھر والوں سے ملاقات ہوئی اور زندگی پھر ایک توازن کے ساتھ شروع ہوئی۔ والدین ایک جگہ رشتہ ٹھہرا چکے تھے کہ کالج میں ایک لڑکی سے شناسائی

ہوئی۔ تفریحاً آنا جانا اور اٹھنا بیٹھنا شروع ہوا۔ جب مخالفت ہونے لگی تو عشق کے آثار پیدا ہونے اور جب ایک آدھ بندش بھی عائد ہوگئی تو زندگی فلمی ہیرو کی پیروڈی سی ہوکر رہ گئی۔ بہر حال پرانا رشتہ منسوخ اور نیا مقرر ہوا۔

شادی سے پانچ برس پہلے یعنی ۱۹۵۲ء میں دہلی کالج میں ایم اے کے لئے داخل ہوا۔ یہاں اپنے کرم فرما ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی سے ملاقات ہوئی جن کی محنت کوشی، ذوقِ مطالعہ اور کام کی دھن نے میرے شوق کو مہمیز کیا۔ رسائل میں لکھنے کی لت لڑکپن سے پڑ چکی تھی۔ ابتدا افسانہ نگاری سے ہوئی۔ پہلا افسانہ کوئٹہ کے ہفتہ وار بلوچستان سماچار میں شائع ہوا۔ نام تو اب بھول چکا ہوں، البتہ اتنا یاد ہے کہ اس دن پاؤں زمین سے کچھ اوپر ہی اوپر تھے۔ رائے دینے یا دل بندھانے والا سوائے بڑے بھائی کے اور کوئی نہ تھا اور ان ہی کو دکھا کر یوں محسوس ہوا گویا ـــــ ساری دنیا کو میں دکھا آیا ـــــ

اس کے بعد چند اور کہانیاں بھی وہیں شائع ہوئیں۔ دہلی آکر ریاست، بیسویں صدی وغیرہ میں لکھتا رہا۔ گھر کے قریب ایک "کلاکی لائبریری تھی" "کلاس فور" یعنی چپراسیوں کے لئے! شاید اسی لئے اردو ہندی کتابوں کا اس میں خاصا ذخیرہ تھا۔ سارا سارا دن وہیں پڑا رہتا۔ یاد ہے کہ اردو فارسی کے بعض امتحان میں نے یا تو اس لائبریری کی وجہ سے دیئے یا پھر اردو بازار کے بعض مہربان کتب فروشوں کی نوازش سے جو کتاب چند دن پڑھنے کے لیے دے دیتے تھے یا پھر ادھار پر معاملہ کرلیتے تھے۔ سنجیدہ مضمون نگاری کی ابتدا میں نے نگار، نوائے ادب اور آجکل سے کی۔ پہلا مضمون نگار میں اکبر الٰہ آبادی پر غالباً ۱۹۵۳ء میں نکلا۔ اردو میں اتحاد پسندی کے رجحانات پر جو مقالہ آل انڈیا اورینٹل کانفرنس احمد آباد میں پڑھا تھا، وہ نوائے ادب میں بھی شائع ہوا۔ آج کل میں پہلا مقالہ غزل سے متعلق شائع ہوا دہلی کالج میگزین کے دلی کالج نمبر میں مدیر معاون کی حیثیت سے شریک رہا اور اس کے لئے بھی دو مضمون لکھے، لیکن ادبی (یا بے ادبی کی) زندگی کا باقاعدہ آغاز ایم۔ اے کی منزل سے گزرنے کے بعد ہوا۔ حکومت ہند سے پی ایچ ڈی کے کام کے لئے وظیفہ ملنا، تحقیق کے دشت ویراں میں صحرا نوردی شروع کرنا، برسوں دہلی یونیورسٹی میں اردو کے ایک استاد اور ایک طالب علم کے سوا دور دور تک کسی کا نظر نہ آنا، رفتہ رفتہ کامیابی کے آثار پیدا ہونا، شعبۂ اردو کا قائم ہونا اور اللہ کے بعض نیک بندوں کا اس کی بنیادوں کو اپنی محنت کے خون سے سینچنا، چندے حکومتِ ہند کی ملازمت کرنا، پھر کیمپ کالج اور سینٹ سٹیفنز کالج سے کام کی ابتدا کرنا، دہلی یونیورسٹی میں ملازم ہونا، لسانیات کی تربیت حاصل کرنا، ریڈر مقرر ہونا اور وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے وسکانسن یونیورسٹی (امریکہ) بلایا جانا؛ یہ سب کچھ آپ بیتی سے زیادہ جگ بیتی ہے جس کے بارے میں اس وقت مفصل لکھنا نہ تو مناسب ہے نہ ممکن۔

آخر میں چند باتیں اپنے ادبی مسلک کے بارے میں۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں جو اردو کے مستقبل کے بارے میں نوحہ گر کو ساتھ رکھتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ غالباً یہ ہے کہ میرا میدان تخلیق نہیں، تحقیق ہے۔ دوسری وجہ میری نفسیاتی کمزوری ہے۔ یعنی رجائیت پسندی، اور تیسرے یہ کہ میں ان تہذیبی اقدار کو عزیز رکھتا ہوں جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلاط اور ارتباط سے وجود میں آئی ہیں۔ یہ بات ہندوستان کا مقدر ہو چکی ہے کہ اس کی سماجی اور تہذیبی زندگی یک رنگ نہیں ہو سکتی۔ اس میں بنیادی وحدت تو موجود ہے لیکن اس کی ظاہری کثرت کو یک رنگ کرنے کی جتنی کوششیں کی گئی ہیں، بار بار ناکام رہی ہیں اس ملک کا فطری ارتقا مختلف عناصر کی آزادانہ نشو و نما کے ساتھ ساتھ ہوا ہے تیرھویں اور چودھویں صدی سے مختلف عناصر میں ارتباط پیدا کرنے کی سعادت کھڑی بولی کو نصیب ہوئی تھی، جسے بنا سنوار کے اردو نے ایک اعلیٰ ادبی منصب تک پہنچایا۔ میرا ایمان ہے کہ نئے ہندوستان کو آج بھی جذباتی ہم آہنگی اور تہذیبی شیرازہ بندی کے لئے اردو کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی انگریزی

اور ہندی کی ان چار پانچ سالوں کے ارتقا میں اُردو نے کس طرح ادبی قدروں کو نکھارا، اس کی پشت پر کن سماجی اور فکری قوتوں کا ہاتھ رہا، اس نے متضاد تہذیبی عناصر سے رشتے لے کر کس طرح ذوق و احساس کی آسودگی کا سامان پیدا کیا۔ اور شائستگی اور لطافت کے کیا کیا معیار پیش کئے۔ ان سب امور سے معروضی علمی انداز میں بحث کرنا اور اُردو کی چار سالہ فکری اور تہذیبی تاریخ لکھنا میری زندگی کا مقصد ہے۔ میرا پی ایچ ڈی کا مقالہ اور میری مطبوعہ کتاب "ہندوستانی قصّوں سے ماخوذ اُردو مثنویاں" اسی وسیع تر کام کی نہایت ادنیٰ اور معمولی شقیں ہیں۔ میرے نزدیک تحقیق میں سب سے زیادہ اہمیت تحقیق کی ضرورت کے واضح احساس کی ہے۔ تحقیق برائے تحقیق گھاس کھودنے کا شغل ہے۔ ادبی تحقیق وہی کارآمد ہے جو کسی نفسیاتی، تاریخی یا سماجی مسئلے کو حل کرنے کی طرف قدم اٹھائے یا کسی ایسی صداقت کے چہرے سے نقاب اٹھائے جس سے دوسری اہم صداقتوں کا پتہ چلانے میں مدد ملے۔ ہمارے ہاں تحقیق اس وقت شخصیت کی راہوں پر چل رہی ہے اور اس کی وجہ مقاصدِ تحقیق سے صالح شعور کا فقدان ہے۔

لسانیات پر میرا کام عشقِ ثانی کی حیثیت سے ۱۹۵۰ میں شروع ہوا جب میں نے معراج العاشقین کا نیا ایڈیشن لسانیاتی نوٹ، مقدمے فرہنگ اور حواشی کے ساتھ شائع کیا۔ اس کے بعد مونوگراف "اُردو تعلیم کے لسانیاتی پہلو" اور دوسرا "اُردوئے دہلی کی کرخنداری بولی" پر شائع ہو چکا ہے۔ امریکہ میں لسانیات کی بڑی دھوم ہے۔ یہاں کے ماہرین نظریاتی سطح پر برطانیہ اور دوسرے یورپی ملکوں کے ماہرین سے آگے نکل گئے ہیں۔ لسانیات کی حدیں منطق اور ریاضی سے ملنے لگی ہیں اور کمپیوٹر کا استعمال ہو گیا ہے۔ اس وقت ماہرین کی سب سے بڑی کوشش یہ ہے کہ ایسا مشینی ذہن تیار کریں جو کسی بھی زبان کی صرف و نحو اور اصوات کا تجزیہ اور وضاحت خود بخود کر سکے۔ اس سلسلے میں لسانیات کی دنیا طلسمات کا سا منظر پیش کرتی ہے جہاں کل آسمان تھا وہاں آج زمین ہے، جہاں کل زمین تھی وہاں سناٹا ہے۔ ارادہ تھا کہ صوتیات پر کام کی ابتدا کروں گا۔ لیکن خطرہ ہوں کہ اس قدر شدت کے کارخانے میں "سکوں" بھی میسر آتا ہے کہ نہیں؟

SOLE DISTRIBUTORS

SAKAR PUBLISHERS PVT., LTD.
107-JOLLY BHAVAN NO. 1,
10 NEW MARINE LINES,
BOMBAY-400 020.

آپ بیتی نمبر
نگراں
کالیداس گپتا رضا
مدیر
صابر دت